محکم متشابہ اور تاویل، علامہ طباطبائی کی نظر میں

ڈاکٹر شیخ محمد حسنین*

بحث کی اہمیت

قرآن کریم میں محکم، متشابہ اور تأویل کی بحث، ایک معرکۃ الآرا بحث ہے۔ علامہ طباطبائیؒ نے اپنی تفسیر ''المیزان فی تفسیر القرآن'' کی تیسری جلد میں اس موضوع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ محکم و متشابہ کی بحث اتنی پرانی ہے کہ صحابہ اور تابعین کے ہاں بھی یہ بحث نظر آتی ہے۔ علامہ طباطبائیؒ کے ہاں اس بحث کی اہمیت اس لحاظ سے بھی بہت بڑھ جاتی ہے کہ خود انہوں نے محکم و متشابہ اور تأویل کی تفسیر میں جو نکتۂ نظر پیش کیا ہے، وہ ان کے بقول، نہ فقط اسلاف کی طرف سے پیش کیے جانے والے نظریات کے ساتھ میل نہیں کھاتا بلکہ اس سے یکسر مختلف بھی ہے۔ ذیل میں ہم یہ کوشش کریں گے کہ اس باب میں علامہؒ کی آرا کو قدرے اختصار کے ساتھ، آسان فہم پیرایوں میں قارئین کی خدمت میں پیش کر دیں۔

قرآنی آیات کی محکم و متشابہ میں تقسیم

قرآن کریم کی سورۂ مبارکہ آل عمران کی آیت ۷، تمام قرآنی آیات کو دو عمدہ قسموں میں تقسیم کرتی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالی ہے:

هُوَ الَّذِی أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَ أُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلاَّ اللهُ وَ الرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا يَذَّكَّرُ إِلاَّ أُولُوا الأَلْبَابِ

یعنی: '' خدا وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی کہ جس میں سے بعض آیات محکم ہیں؛ یہی آیات اس کتاب کی اصل و اساس ہیں اور بعض دیگر آیات متشابہ ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے سو وہ متشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں؛ اس غرض سے کہ فتنہ بپا کریں اور اس کی تأویل تلاش کریں؛ حالانکہ اس کی تأویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں راسخ مقام رکھتے ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم اُس پر ایمان لائے، سب کچھ خدا کی طرف سے ہے اور نصیحت تو فقط صاحبان عقل ہی پاتے ہیں۔'' (1)

یہاں علامہ طباطبائیؒ مذکورہ آیت میں ''أَنْزَلَ'' کے کلمے سے اس امر پر ایک ظریف استدلال پیش کرتے ہیں کہ محکم و متشابہ کی تقسیم کا تعلق قرآن کریم کی سب آیات سے ہے نہ کہ بعض آیات سے۔ چنانچہ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں اس آیت میں چونکہ خداوند تعالی نے قرآن کریم کی ایک امر واحد کی حیثیت سے ایک خصوصیت بیان فرمانا تھی لہٰذا ''انزال'' کا کلمہ استعمال کیا ہے اور ''تنزیل'' کا کلمہ استعمال کرنے سے پرہیز کیا گیا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کا بیان اس امر کا تقاضا کرتا تھا کہ مذکورہ بالا آیت میں ''أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ'' کے الفاظ استعمال کیے جائیں نہ کہ ''نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ'' کے الفاظ؟ تو جواب یہ ہے کہ وہ خصوصیت، قرآن کریم کی تمام آیات کی دو قسموں یعنی محکم و متشابہ میں تقسیم ہی تھی اور ''انزال'' کے لفظ نے بھی گویا اس امر کی ترجمانی کر دی کہ یہ حکم، قرآن کریم کی سب آیات کا ہے نہ کہ بعض آیات کا۔

---

*۔ ڈائریکٹر نورالہدیٰ مرکز تحقیقات (نمت)، بارہ کہو، اسلام آباد

خلاصہ یہ کہ قرآن کریم کی سب آیات نہ محکم ہیں، نہ متشابہ، بلکہ بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ۔ نیز یہ کہ متشابہ آیات، محکم آیات کی طرف لوٹتی ہیں اور انہی کی روشنی میں معنی و مفہوم پاتی ہیں۔ پس سب سے پہلی اور قطعی بات یہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات محکم ہیں اور بعض متشابہ۔

قرآن کا محکم، متشابہ سے منافات نہیں رکھتا

علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں محکم، کسی ایسی چیز پر بولا جاتا ہے جو فاسد نہ ہوتی ہو اور نہ ہی خلل پذیر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قضاوت کے باب میں صادر کیے جانے والے قطعی فیصلوں کو ''حکم'' کہا جاتا ہے۔ نیز یہی وجہ ہے کہ ایسے علم و دانائی کو بھی '' حکمت'' کہا جاتا ہے جو ٹھوس دلائل و براہین پر استوار ہو اور بطلان پذیر نہ ہو۔ بنابرایں، اگر قرآن کریم کی بعض آیات کی صفت ''محکم'' بیان کی گئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ آیات، اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے قطعی آیات ہیں اور ان کے معانی میں کسی قسم کا شک و شبہ اور تشابہ نہیں پایا جاتا۔

یہاں ممکن ہے یہ کہا جائے کہ قرآن کریم کی تو سب آیات محکم ہیں؛ کیونکہ سورۂ مبارکہ ہود کی پہلی آیت میں خود قرآن کریم کا ارشاد ہے: '' كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ'' یعنی: ''[قرآن کریم ایک] ایسی کتاب ہے جس کی آیات کو محکم قرار دیا گیا ہے اور پھر انہیں حکیم و خبیر ذات کی طرف سے تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔'' تو یہ آیۂ شریفہ پورے قرآن کریم کو ایک محکم کتاب قرار دے رہی ہے۔ اب اگر قرآن کریم کی بعض آیات متشابہ ہوں تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ پورا قرآن کریم محکم نہ ہو اور یہ ایک کھلا تناقض ہے کہ پورا قرآن کریم محکم ہو بھی اور نہ بھی ہو۔

لیکن علامہؒ کے نزدیک یہاں ایسا کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔ کیونکہ سورہ ہود کی مذکورہ آیت جہاں قرآن کے محکم ہونے کی بات کر رہی ہے، عین اسی وقت تحکیم کے بعد ''تفصیل'' کی بات بھی کر رہی ہے۔ اور یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ یہاں اِحکام سے مراد، کتاب کے حالات میں سے ایک حالت کا بیان ہے۔ اور وہ حالت عبارت ہے اُس کیفیت سے جو قرآن کریم پر اس کے نزول سے قبل حاکم تھی۔

گویا سورۂ مبارکہ ہود کی مذکورہ آیت میں قرآن کریم کی اُس حالت کی بات ہو رہی ہے جب قرآن واحد تھا اور سوروں اور آیتوں میں تقسیم نہیں ہوا تھا اور نہ ہی اس کی آیات نے کثرت کا لباس پہنا تھا۔ اور ایسا تب تھا جب قرآن کریم نہ نازل ہوا تھا اور نہ ہی الفاظ و آیات میں ڈھلا تھا۔ اور جہاں تک سورۂ آل عمران کی مورد بحث آیت کا تعلق ہے تو اس میں جس محکم و متشابہ کی بات ہوئی ہے وہ قرآنی حقیقت پر اس کے نزول کے بعد عارض ہونے والی ایک حالت کا بیان ہے۔ بنابرایں، یہاں تناقض نہیں ہے کیونکہ اہل منطق کے الفاظ میں یہاں موضوع واحد نہیں ہے؛ جبکہ تناقض میں موضوع کی وحدت شرط ہوتی ہے۔ نیز قرآن کریم کی آیات میں تشابہ کے پائے جانے کا لازمہ قطعاً یہ نہیں ہے کہ قرآن کریم ایک محکم کتاب نہیں ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اگر علامہ طباطبائیؒ پر یہ اشکال کیا جائے کہ قرآن کریم کی ایک صفت، اس کی تمام آیات کے درمیان پائی جانے والی مشابہت ہے۔ کیونکہ سورۂ مبارکہ الزمر کی آیت ۲۳ میں ارشادِ پروردگار ہے: '' اللَّهُ نَزَّلَ أَحْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِيَ۔۔۔'' الآیہ یعنی: '' اللہ نے بہترین کلام نازل کیا ہے؛ ایک ایسی کتاب کی صورت میں کہ جس کی آیات باہم مشابہ اور مکرر ہیں۔۔۔'' اور اس مشابہت کا لازمہ یہ ہے کہ اگر قرآن کریم کی بعض آیات محکم ہیں تو پھر سب آیات کو محکم ہونا چاہیے اور اگر بعض متشابہ ہیں تو پھر سب آیات کو متشابہ ہونا چاہیے۔ پس یہ نہیں ہو سکتا کہ قرآن کریم کی بعض آیات محکم ہوں اور بعض متشابہ۔

اس احتمالی اشکال کے حوالے سے علامہؒ کا مؤقف یہ ہے کہ سورہ آل عمران کی آیت ۷، اور سورہ الزمر کی آیت ۲۳ میں ''تشابہ'' کا کلمہ ایک معنی میں استعمال نہیں ہوا۔ کیونکہ سورہ آل عمران کی آیت ۷ میں ''تشابہ'' سے مراد، کسی آیت کے مفہوم کا اکیلے میں سامع پر واضح نہ ہونا

اور تنہا ایک محکم آیت کی طرف رجوع کے بعد واضح ہوتا ہے۔ جبکہ سورہ الزمر کی آیت ۲۳ میں "تشابہ" سے مراد یہ ہے کہ جس مطلب کے بیان کیلئے قرآن کریم نازل ہوا ہے، قرآن کی سب آیات بھی اُس مطلب کے بیان میں باہم ہماہنگ ہیں۔

پس سورہ الزمر میں جس تشابہ کی بات ہوئی ہے وہ پورے قرآن کا کتاب ہدایت ہونے اور ہماہنگ مطالب کے بیان میں تشابہ ہے۔ لیکن جس تشابہ کی بات سورہ آل عمران میں ہوئی ہے اس سے مراد بعض آیات کا اپنے معنی و مفہوم میں صریح نہ ہونا ہے۔ اور اس امر پر دلیل یہ کہ یہاں تشابہ، "محکم" کے مقابلے میں ذکر ہوا ہے۔ نیز جن آیات کو متشابہ قرار دیا گیا ہے ان کی پیروی کرنے والوں کو فتنہ گر، کج دل قرار دیا گیا ہے۔

علامہؒ کے نزدیک "امُّ الکتاب" میں "امّ" کا "الکتاب" کی طرف اضافہ بھی لامیہ نہیں ہے۔ یہاں "امّ" کی اضافت "الکتاب" کی طرف وہ نہیں ہے جو "امّ الاطفال" میں ہے۔ یعنی جس طرح "امّ الاطفال" میں اضافت، عمومیت اور استغراق کا معنی دیتی ہے، "امُّ الکتاب" میں ایسا نہیں ہے؛ بلکہ یہاں اضافہ "میمیہ" ہے؛ جس طرح کہ "فقہاًالقدماء" میں فقہاً کا "القدماً" کی طرف اضافہ۔ جس طرح "فقہاًالقدمائ" میں سب فقہاً نہیں بلکہ فقہاً میں سے بعض (قدماً) ہی مراد ہیں، اسی طرح "امُّ الکتاب" میں بھی کتاب سے مراد قرآن کریم کی سب آیات نہیں بلکہ فقط متشابہ آیات ہی مراد ہیں اور محکم آیات انہی آیات کیلئے مرجع ہیں۔ پس "امُّ الکتاب" کا اضافہ بھی اس امر کا بیانگر ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات محکم ہیں اور بعض دیگر متشابہ۔

تشابہ کا معنی و مفہوم

اب دیکھنا یہ ہے کہ تشابہ کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ علامہؒ نے تشابہ کی جو تعریف نقل فرمائی ہے، وہ یہ ہے: "تَوَافُقُ أَشْيَاءِ مُخْتَلِفَةٍ وَ اتِّحَادُهَا فِيْ بَعْضِ الْاَوْصَافِ وَ الْكَيْفِيَّاتِ"۔ یعنی: "مختلف اشیاً کا بعض اوصاف و کیفیّات میں باہمی توافق اور اتحاد، تشابہ کہلاتا ہے۔" اب اگر سورہ الزمر میں کتاب الٰہی کی یہ وصف بیان ہوئی ہے کہ وہ متشابہ ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کریم کی سب آیات میں اُس مطلب کے بیان میں مکمل ہماہنگی پائی جاتی ہے جس کے بیان کی غرض و غایت سے قرآن کریم نازل ہوا ہے اور اس لحاظ سے سب آیات ایک ہی نسق اور قاعدے پر نازل ہوئی ہیں۔ لیکن سورہ آل عمران، ۷ آیت میں تشابہ سے مراد، کسی آیت کے مفہوم کا اکیلے میں سامع پر واضح نہ ہونا اور تنہا ایک محکم آیت کی طرف رجوع کے بعد واضح ہونا ہے۔

مثال کے طور پر سورۂ طٰہٰ کی آیت ۵: "الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى" (2) میں استواً کا معنی و مفہوم واضح نہیں ہے۔ لیکن جب اس آیت کی تلاوت کرنے والا، سورۂ الشوریٰ کی آیت ۱۱: "لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ" (3) کی تلاوت کرتا ہے تو اس پر واضح ہو جاتا ہے کہ یہاں "استواً" سے مراد، اٹھنے بیٹھنے کی کوئی حالت نہیں بلکہ اس سے مراد، قدرت و سلطنت ہے۔ لہٰذا یہاں "استواً" کسی مکان کا سہارا لینے اور اس پر تکیہ لگانے کا معنی نہیں دے رہا کہ جس کا لازمہ جسم و جسمانیت ہو، بلکہ احاطے، قدرت اور سلطنت کا معنی دے رہا ہے۔

اسی طرح اگر سورۂ مبارکہ القیامہ کی آیت ۲۳: "إِلَىٰ رَبِّهَا نَاظِرَةٌ" (4) کو اکیلے میں دیکھا جائے تو اس کا معنی و مفہوم واضح نہیں ہے۔ لیکن جب اسی آیت کو سورۂ انعام کی آیت ۱۰۳: "لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ" (5) کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو اس کا معنی واضح ہو جاتا ہے اور یہ امر آشکار ہو جاتا ہے کہ یہاں دیکھنے سے مراد ظاہر کی آنکھ سے دیکھنا نہیں، بلکہ اس سے مراد باطن کی آنکھ سے بصیرت کا دیکھنا ہے۔ منسوخ آیات کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے کہ جب انہیں ناسخ آیات کے تناظر میں دیکھا جائے تو ان کا معنی و مفہوم واضح ہو جاتا ہے۔

محکم و متشابہ کا معیار

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات کی محکم و متشابہ میں تقسیم کا معیار کیا ہے؟ کن آیات کو محکم آیات قرار دیا جائے اور کن آیات کو متشابہ؟ علامہ طباطبائیؒ کے ہاں اس سوال کا جواب ایک مقدمہ کے بیان پر منحصر ہے۔ وہ مقدمہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات میں سے کوئی

آیت بھی بے معنی و مفہوم نہیں ہے۔ قرآن کریم کی ہر آیت کا ایک معنی و مفہوم ہے۔ لیکن اپنے معنی و مفہوم پر دلالت کے لحاظ سے آیات دو قسم کی ہیں۔

بعض آیات کی دلالت اپنے معانی پر اتنی واضح ہے کہ اُن معانی سے ہٹ کر کوئی اور معنی قاری کے ذہن میں آتا ہی نہیں ہے۔ ایسی آیات، یقینا محکمات کے زمرے میں شمار ہوتی ہیں۔ لیکن بعض آیات کئی ایسے معانی پر دلالت کرتی ہیں کہ علامہؒ کے بقول: " یلتبس بعضھا ببعض"۔ یعنی بعض معانی، بعض دیگر معانی کی جگہ لے رہے ہوتے ہیں اور قاری یہ تشخیص نہیں دے پاتا کہ یہاں کونسا معنی مراد ہے۔

ان آیات کا معاملہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے۔ یا تو یہ کہا جائے کہ یہ آیات کسی خاص معنی پر دلالت ہی نہیں کرتیں۔ لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا؛ کیونکہ اس صورت میں کلام الٰہی بے معنی رہ جائے گا اور آیات قرآن بلا دلالت۔ یا پھر یہ کہا جائے ایسی آیت کے محتمل معانی میں سے کوئی ایک معنی مراد ہے۔ لیکن اس صورت میں اس معنی کی تعیین کا مسئلہ در پیش آتا ہے۔ یعنی کیسے معین کیا جائے کہ اس آیت کی دلالت کس معنی پر ہے؟ یا علامہؒ کے الفاظ میں کیسے پتہ چلے کہ "حقُ المراد" کیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ وہ تمام معانی جن پر آیت کے الفاظ دلالت کرتے ہوں، حق المراد نہیں ہو سکتے۔ بلکہ تنہا وہی معانی مراد ہو سکتے ہیں جو توحید، نبوت، احکام شریعت کی تشریع اور معاد جیسے مسلمہ قرآنی اصولوں سے ہماہنگ ہوں۔ بنابراین، ایسی آیات کے معانی کی تعیین، تنہا ان آیات کے معانی کے تناظر میں کی جا سکتی ہے جو مسلمہ قرآنی تعلیمات اور اصولوں کی بیانگر ہوں۔ یوں قرآن کی بعض آیات اُس کی بعض دیگر آیات کی توضیح و تفسیر پیش کرتی ہیں اور ان کے معانی معین کرتی ہیں۔ یہاں سے محکم و متشابہ کی تعیین کا یہ معیار ہمارے ہاتھ آجاتا ہے کہ محکمات، وہ آیات ہیں جن میں مسلمہ قرآنی اصول بیان ہوئے ہیں اور متشابہات، وہ آیات ہیں جن کا معنی محکمات کی طرف رجوع کے بعد معیّن ہوتا ہے۔

قرآن میں تشابہ کیوں؟

اگر کوئی یہ پوچھے کی مسلمہ قرآنی اصولوں کی روشنی میں متشابہ آیات کی تفسیر تو اپنی جگہ ٹھیک، لیکن آیا اس کا لازمہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی بعض آیات ضروری طور پر متشابہ ہی ہوں؟ تو جواب یہ ہے کہ جی ہاں! قرآن کریم میں تشابہ کا پایا جانا ضروری ہے۔ لیکن اس لیے نہیں کہ قرآن کریم کے بیان میں کوتاہی پائی جاتی ہے، بلکہ اس لیے کہ انسانی فہم میں کوتاہی پائی جاتی ہے۔ یہ کوتاہی کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے؟ اس سوال کے جواب میں علامہؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم میں تشابہ کے پائے جانے کی اساسی وجہ، درج ذیل دو قسم کی قرآنی تعلیمات ہیں:

ا۔ ایک، وہ تعلیمات جو بہت عالی مطالب پر مشتمل ہیں اور انسان اپنے حواسِ خمسہ کی مدد سے ان کا ادراک نہیں کر سکتا۔ یہ تعلیمات نہ تو مادی پیمانوں پر تولی جا سکتی ہیں اور نہ ہی عام افہام اُن کا احاطہ کر سکتے ہیں۔ للذا یہ تعلیمات جب ایسے انسان کے سامنے رکھی جاتی ہیں کہ جس کا ذہن فقط محسوسات اور مادیات سے مأنوس ہے، تو وہ اِن غیر مادی تعلیمات کو بھی اپنے ذہن کے بنائے ہوئے اُن مادی سانچوں میں ڈھالنا شروع کر دیتا ہے جن میں وہ مادی معانی و مفاہیم کو ڈھالتا ہے۔ للذا ایسے شخص کے سامنے جب "إِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ" (6) یا " وَجَاءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا" (7) جیسی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو اُس کے ذہن میں ان آیات کے الفاظ سے فوری طور پر اجسام کے اوصاف و خواص ٹپکنے لگتے ہیں اور وہ خداوند تعالی کی طرف جسم کے خواص کی نسبت دینے لگتا ہے۔

لیکن اگر انسان اُن مسلمہ قرآنی اصولوں کی طرف رجوع کرے جو خداوند تعالی کو جسم اور جسمانیت سے پاک و منزہ قرار دیتے ہیں تو قاری پر ان آیات کے معانی واضح ہو جاتے ہیں اور وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہاں پروردگار کے آنے سے مراد، خود خدا کا کسی ظاہری جسم میں چل کر آنا نہیں، بلکہ مراد "امر الٰہی" کا آنا ہے۔

پس تشابہ کے وجود میں آنے کا اصل سبب، انسانی فہم کا قصور ہے۔ اور اگر انسانی فہم قاصر نہ ہو تو اس کیلئے وہی آیت محکم بن جاتی ہے جو قاصر افہام کیلئے متشابہ ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے: " أَنزَلَ مِنَ السَّمَاءِ مَاءً فَسَالَتْ أَوْدِيَةٌ بِقَدَرِهَا"

(8) تو گویا جس طرح ہر ندی اپنی ظرفیت کے مطابق اپنے دامن میں بارش کا پانی لیتی ہے، اسی طرح ہر انسانی فہم بھی اپنی ظرفیت کے مطابق قرآنی مطالب اخذ کرتا ہے۔ اور انسانی افہام کی تنگی، در حقیقت قرآنی آیات میں تشابہ کا سبب بن جاتی ہے۔

۲۔ قرآن کریم کی تعلیمات کی دوسری قسم، وہ ہے جس کا تعلق انسان کے اجتماعی اور معاشرتی مسائل سے ہے۔ یعنی وہ آیات جن میں شریعت کے اجتماعی قوانین بیان ہوئے ہیں۔ انسان کی اجتماعی زندگی کی حقیقت یہ ہے کہ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ للذا بدلتے اوضاع واحوال کے ساتھ ساتھ ، اجتماعی قوانین واحکام بھی بدلتے رہتے ہیں۔

اس حقیقت کے مدّ نظر قرآن کریم کی آیات جو کہ کم و بیش ۲۳ ؍ سال کے عرصہ میں وقفوں وقفوں سے نازل ہوئیں، انسان کے اجتماعی اوضاع واحوال کے بدل جانے کے سبب، بعض آیات منسوخ ہو گئیں اور ان کی جگہ ناسخ آیات نے لے لی۔ ناسخ و منسوخ کا یہ سلسلہ بھی قرآنی آیات میں تشابہ کا سبب بنا۔ یہاں بھی تشابہ، در حقیقت، قرآنی بیان کے قاصر ہونے سے ایجاد نہیں ہوا، بلکہ انسان کے اجتماعی حالات کے بدل جانے کی وجہ سے ایجاد ہوا ہے۔ یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ قرآن بدل گیا، بلکہ دراصل، انسانی حالات کے بدل جانے سے انسانی معاشرہ کی مصلحتیں بدلیں، مصلحتوں کے بدلنے سے شرعی قوانین واحکام بدلے اور احکام کے بدلنے سے آیات بدلیں اور یوں تشابہ وجود میں آیا۔

بنابرایں، قرآن کریم کی آیات میں تشابہ کے آجانے کا ایک اور سبب یہ ہے کہ جب ناسخ و منسوخ سے ناآشنا انسان بعض آیات کو بعض دیگر سے بظاہر ٹکراتا دیکھتا ہے تو اُس پر معاملہ مشتبہ ہو جاتا ہے اور قرآنی آیات تشابہ۔ لیکن یہی انسان جب منسوخ آیات کو ناسخ آیات کی طرف لوٹا دیتا ہے تو منسوخ آیات کا معنی و مفہوم بھی اس پر واضح ہو جاتا ہے۔

تأویل و تشابہ

قرآن کریم میں محکم و تشابہ کی بحث سے مربوط ایک اور بحث، تأویل کی بحث ہے۔ تأویل کی بحث کا محکم و تشابہ کی بحث سے رابطہ، خود قرآن کریم نے جوڑا ہے۔ چنانچہ سورۂ مبارکہ آل عمران کی آیت ۷؍ میں ارشاد فرماتا ہے:

"هُوَ الَّذِی أَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آیَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَ أُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِینَ فِی قُلُوبِهِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَ ابْتِغَاءَ تَأْوِیلِهِ وَ مَا یَعْلَمُ تَأْوِیلَهُ إِلاَّ اللهُ وَ الرَّاسِخُونَ فِی الْعِلْمِ یَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَ مَا یَذَّكَّرُ إِلاَّ أُولُوا الْأَلْبَابِ"

یعنی: " خدا وہی ہے جس نے آپ پر کتاب نازل فرمائی کہ جس میں سے بعض آیات محکم ہیں؛ یہی آیات اس کتاب کی اصل واساس ہیں اور بعض دیگر آیات تشابہ ہیں۔ تو جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، سو وہ تشابہ آیات کی پیروی کرتے ہیں، اس غرض سے کہ فتنہ بپا کریں اور اس کی تأویل تلاش کریں؛ حالانکہ اس کی تأویل خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ لوگ جو علم میں راسخ مقام رکھتے ہیں یہ کہتے ہیں کہ ہم اُس پر ایمان لائے، سب کچھ خدا کی طرف سے ہے اور نصیحت تو فقط صاحبان عقل ہی پاتے ہیں۔"

اس آیۂ شریفہ میں کج دلوں کی طرف سے تشابہ آیات کی پیروی کا ہدف، فتنہ پردازی اور تأویل تک دستری کا زعم قرار دیا گیا ہے۔ گویا جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ تشابہ آیات کی تأویل سے آشنائی کا گھمنڈ رکھتے ہیں؛ حالانکہ تشابہ آیات کی تأویل سے فقط خدا آشنا ہے یا وہ صاحبان ایمان کہ جو علم میں راسخ مقام پر فائز ہیں۔

اس آیۂ شریفہ سے جہاں کج دلوں کی تشابہ آیات کی پیروی کی غرض و غایت کا پتہ چل رہا ہے، وہاں تشابہ آیات کی ایک خصوصیت بھی سامنے آ رہی ہے اور وہ یہ کہ تشابہ آیات کی کوئی نہ کوئی تأویل پائی جاتی ہے۔ اور خدا اور خدا کے وہ صاحبان ایمان بندے جو علم میں راسخ مقام رکھتے ہیں، اس تأویل سے آشنا ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو بھی تشابہ آیات کی تأویل سے آشنا ہو، وہ ان آیات کے معنی و مفہوم کے فہم میں کسی مشکل کا شکار نہیں ہوتا۔ اگرچہ اس آیت کا ابتدائی ظہور انہی معانی میں ہے لیکن یہاں سوال یہ ہے کہ آیا تأویل فقط تشابہ آیات میں پائی جاتی ہے؟ نیز یہ کہ تأویل سے مراد کیا ہے؟ ان سوالات کے جواب میں علامہؒ کا دعوی یہ ہے کہ تأویل فقط تشابہ آیات میں نہیں بلکہ محکم آیات میں بھی پائی

جاتی ہے۔ نیز یہ کہ تأویل سے مراد وہ سرچشمہ اور منبع ہے کہ جو شخص بھی اِس سرچشمہ تک پہنچ جائے، اُس کیلئے کسی بھی آیت کا فہم مشکل نہیں رہتا۔ لیکن واضح سی بات ہے کہ تأویل کا موضوع اتنا آسان فہم نہیں کہ اس کے بیان میں اسی ایک جملے پر اکتفا کر لیا جائے۔ یقینا یہی وجہ ہے کہ علامہ طباطبائیؒ نے اس بحث کو درج ذیل مراحل میں نبھایا ہے:

قرآن کریم میں "تأویل" کا استعمال

قرآن کریم کی کئی آیات میں "تأویل" کا موضوع زیرِ بحث آیا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ مبارکہ اعراف کی آیت ۵۳ میں ارشاد باری تعالی ہے: "هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا تَأْوِيلَهُ يَوْمَ يَأْتِي تَأْوِيلُهُ يَقُولُ الَّذِينَ نَسُوهُ مِن قَبْلُ قَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ۔۔۔" الآیہ یعنی: "آیا یہ لوگ صرف اس کتاب [کی تعلیمات] کے انجام کار کے انتظار میں ہیں؟ جس دن وہ انجام کار سامنے آئے گا تو وہ لوگ جو اس سے پہلے اسے بھولے ہوئے تھے کہیں گے: ہمارے پروردگار کے پیغمبر حق لے کر آئے تھے۔۔۔"

علامہ طباطبائیؒ کے مطابق اس آیت میں "تأویل" کا کلمہ ان حقائق کے بارے میں استعمال ہوا ہے جن کی خبر نبی اکرم ﷺ نے دی ہے اور یہ حقائق قیامت کے دن کھل کر سب کے سامنے آجائیں گے۔ لہٰذا اس آیت کی روشنی میں بعض لوگوں نے "تأویل" کی تعریف میں کہا ہے کہ: "تأویل سے مراد، وہ خارجی حقیقت ہوتی ہے جو کسی سچی خبر کا مصداق ٹھہرے۔" لیکن علامہؒ اس تعریف کو اس دلیل کی بنیاد پر ردّ فرماتے ہیں کہ اگر تأویل سے مراد یہی ہو تو پھر تأویل، فقط قیامت کے احوال کی پیش گوئی کرنے والی آیات سے مختص رہ جائے گی؛ حالانکہ سورۂ آل عمران کی آیت ۷ میں تأویل کو پوری کتاب کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ جیسا کہ سورۂ مبارکہ یونس کی آیت ۳۹ میں بھی تأویل کو پوری کتاب اور کتاب کی تمام آیات کی طرف نسبت دی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

"بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ" یعنی: "بلکہ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے علم کے احاطے میں آئی ہی نہیں ہے اور نہ ہی ان کے پاس اس [کتاب] کی تأویل آئی ہے۔ اسی طرح ان سے پہلے والوں نے بھی جھٹلایا تھا، پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا۔"

اس آیت کے تناظر میں بعض لوگوں نے تأویل کی تعریف یہ کی ہے کہ: "تأویل، اس خارجی اور عینی امر کا نام ہے جس پر کلام کا تکیہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر کلام، خبری ہو تو وہ خارجی حقیقت، واقعہ اور حادثہ اُس کلام کی تأویل کہلائے گا جس کے بارے میں یہ کلام خبر دے رہی ہے۔ اور اگر یہ کلام خبری نہیں بلکہ انشائی ہو (جیسا کہ آیات الاحکام "انشائی" کلام ہیں) تو تأویل سے مراد، عالم خارج میں تحقق پانے والے وہ مصالح و مفاسد ہوں گے جو ان احکام پر عمل کا لازمی نتیجہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورۂ مبارکہ الاسرائی آیت ۳۵ میں ارشاد فرماتا ہے: "وَأَوْفُوا الْكَيْلَ إِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيمِ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ تَأْوِيلًا" یعنی: "اور تم ناپتے وقت پیمانے کو پورا کر کے دو اور جب تولو تو ترازو سیدھی رکھو؛ بھلائی اسی میں ہے اور انجام بھی اس کا زیادہ بہتر ہے۔" تو یہاں پیمانے کو پورا پورا تولنے کی تأویل، درحقیقت وہی مصلحت ہے جو پورا تولنے میں پائی جاتی ہے؛ یعنی: "انسانی معاشرے کا استحکام اور لین دین کے امور کی درستگی"۔

لیکن علامہ طباطبائیؒ، تأویل کی مذکورہ تعریف کو بھی پسند نہیں فرماتے۔ کیونکہ اگر تأویل کی مذکورہ تعریف مان لی جائے تو سب سے پہلے یہ لازم آتا ہے کہ تأویل، نام ہو فقط اُس خارجی اثر اور عینی حقیقت کا جو انسانی معاشرہ کے افراد کے کسی فعل کا نتیجہ ہے؛ جب کہ ایسا نہیں ہے۔ اور دوسری مشکل یہ ہے کہ جب ایک بات کی بازگشت کئی امور کی طرف ممکن ہو تو ہر امر کی طرف بازگشت، تأویل نہیں کہلاتی؛ بلکہ تنہا ایک مخصوص امر کی طرف بازگشت ہی "تاویل" کہلاتی ہے۔

جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت موسی۔ اور حضرت خضرؑ کے قصہ میں ارشاد فرماتا ہے: "سَأُنَبِّئُكَ بِتَأْوِيلِ مَا لَمْ تَسْتَطِع عَّلَيْهِ صَبْرًا" یعنی: "جلد میں آپ کو ان باتوں کی تأویل بتاتا ہوں"۔ تو اس قصہ میں حضرت موسیؑ نے حضرت خضرؑ کے تین کارنامے دیکھے۔ پہلا، مسکینوں کی کشتی

میں سوراخ کرنا، دوسرا، ایک لڑکے کا قتل اور تیسرا، کوئی اجرت لیے بغیر یتیم بچوں کی دیوار کھڑی کرنا۔ اب ان تین واقعات کو کئی عنوان دیے جا سکتے تھے۔ یا دوسرے الفاظ میں ان واقعات کی بازگشت کئی امور کی طرف ہو سکتی تھی۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے ان واقعات کو جو عنوان دیے وہ یہ تھے:

۱۔ اہل سفینہ کی ہلاکت کا سبب مہیا کرنا؛

۲۔ ایک نفس زکیہ کا قتل؛

۳۔ بغیر اجرت لیے اُن لوگوں کی دیوار کھڑی کرنا تھا کہ جو کھانا کھلانے کیلئے بھی آمادہ نہ تھے۔

لیکن آیا واقعاً حضرت خضر علیہ السلام کے ہاتھوں انجام پانے والے ان واقعات کی بازگشت انہی عناوین کی طرف تھی؟ اور آیا یہ عناوین، ان واقعات کی تأویل قرار پا سکتے تھے؟ یقیناً نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان واقعات کو یہ عنوان دیے جا سکتے ہیں لیکن یہ عنوان، ان واقعات کی تأویل نہیں تھے۔ اس لیے کہ تأویل، ہر وہ عنوان نہیں ہوتا جو کسی قول یا فعل کو دیا جا سکتا ہو، بلکہ کسی قول و فعل کی تأویل تو فقط وہ خاص عنوان ہی قرار پا سکتا ہے جو حقیقت میں بھی اس قول و فعل کا سرچشمہ ہو۔

لہٰذا ان واقعات کی تأویل سے فقط حضرت خضرؑ ہی آشنا تھے اور جب حضرت موسیٰؑ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تو حضرت خضرؑ نے ان واقعات کی تأویل سے پردہ اٹھایا اور انہیں باخبر کر دیا کہ ان واقعات پر جو عنوان صادق آتے ہیں وہ اہل سفینہ کی ہلاکت کا سبب مہیا کرنا، نفس زکیہ کا قتل اور بلا سود و منفعت اور بغیر کسی دلیل کے کسی کی دیوار کھڑی کرنا نہیں، بلکہ ان واقعات کے اصل عناوین، مسکینوں کی کشتی کو غصب ہونے سے بچانا، بوڑھے مؤمن والدین کیلئے بدکردار اور کافر اولاد کی جگہ ایک نیک اور صالح اولاد کی جاگزینی اور دو یتیم بچوں کے خزانے کو محفوظ بنا لینا ہیں۔ پس حضرت خضر ـکے کاموں کا مرجع اور متعلق وہ عنوان نہیں تھے جو حضرت موسیٰؑ نے سمجھے بلکہ وہ عنوان تھے جو خود حضرت خضرؑ نے دیے۔ نیز حضرت خضرؑ نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ انہوں نے یہ کام اپنی طرف سے نہیں (وَ مَا فَعَلْتُهُ عَنْ اَمْرِیْ) بلکہ پروردگار عالم کے حکم سے انجام دیے ہیں۔

علامہ طباطبائیؒ فرماتے ہیں کہ سورۂ یوسف کی کئی آیات اور قیامت کے متعلق کئی آیات میں بھی تأویل کا لفظ کچھ ایسے ہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اس بحث سے علامہؒ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ:

۱۔ کسی بھی آیت کے تأویل پر مشتمل ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ آیت حتمی طور پر متشابہ بھی ہو۔

۲۔ تأویل فقط متشابہ آیات کی نہیں ہوتی بلکہ پورا قرآن (بشمول محکمات) تأویل رکھتا ہے۔

۳۔ تأویل، اُن مفاہیم کا نام نہیں ہے جن پر کسی آیت کے الفاظ دلالت کرتے ہیں، بلکہ تأویل تو خارجی اور عینی حقائق کا نام ہے۔ لہٰذا اگر آیات کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ تأویل رکھتی ہیں تو یہ وصف بحال متعلق ہے۔ یعنی جن مفاہیم کو یہ آیات بیان کرتی ہیں، وہ مفاہیم، عینی مصادیق کی ترجمانی کرتے ہیں۔ (9)

جہاں تک تأویل سے کسی لفظ کے ظاہری معنی کی بجائے ایک ایسا معنی مراد لینے کا تعلق ہے کہ جس پر الفاظ کا ظاہر دلالت نہ کرتا ہو، تو علامہؒ کے نزدیک، تأویل کا یہ معنی، نو مولود ہے اور قرآن کے نزول کے بعد وجود میں آیا ہے۔ لہٰذا علامہؒ کے نزدیک سورۂ مبارکہ آل عمران کی آیت ۷ میں تأویل سے مراد قطعاً یہ نہیں ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ آیات کیلئے ایسے معانی تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جن پر آیات کے الفاظ کے ظواہر دلالت نہیں کرتے۔ لہٰذا "وَ ابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ" کی تفسیر میں بعض لوگوں کا یہ کہنا کہ کج دل افراد، متشابہ آیات سے ان کے ظاہری معنی مراد لینے کی بجائے کوئی اور معنی تلاش کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، غلط فہمی کا نتیجہ ہے اور یہ معنی مراد لینے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

نقد اقوال

مذکورہ بحث کے بعد علامہ طباطبائیؒ ایک تفصیلی بحث کے ضمن میں محکم و متشابہ اور تأویل کے باب میں اُن مفسرین کے اقوال پر نقد و تبصرہ فرماتے ہیں کہ جن کی رائے، خود علامہؒ کی رائے سے مختلف ہے:

۱۔ ان اقوال میں سے سب سے پہلا قول جو ابن عباس کی طرف منسوب ہے یہ ہے کہ قرآن کریم میں تنہا تین آیات (قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا ۔۔۔ الآیات، سورۂ انعام ۱۵۱ تا ۱۵۳) محکم ہیں۔ جبکہ متشابہ آیات عبارت ہیں حروف مقطعات سے؛ کہ جنہیں یہودی سمجھ نہ پاتے تھے۔

علامہؒ کی نظر میں پہلے تو ابن عباس کی طرف اس قول کی نسبت ناروا ہے اور اگر یہ نسبت درست بھی ہو تو اس قول پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ نیز، اگر یہ قول مان لیا جائے تو لازم آتا ہے قرآن کی کچھ آیات محکم، کچھ متشابہ اور کچھ نہ محکم اور نہ متشابہ ہوں؛ حالانکہ سورہ آل عمران کی آیت ۷، اس تقسیم سے منافات رکھتی ہے۔

۲۔ دوسرا قول، پہلے قول کے برعکس ہے۔ ابو فاختہ کی طرف منسوب اس قول کے مطابق حروف مقطعات، محکمات ہیں اور دیگر آیات متشابہ ہیں۔ علامہ طباطبائیؒ کی نظر میں نہ فقط اس قول پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ یہ قول بھی سورہ آل عمران کی آیت ۷ سے منافات رکھتا ہے۔ کیونکہ اس صورت میں فواتح سور کے علاوہ قرآن کی دیگر تمام آیات متشابہ ہو جائیں گی اور اگر ایسا ہو تو اُن کی پیروی کرنا بھی مذموم ہو جائے گا؛ کیونکہ متشابہ کو جب تک محکم کی طرف لوٹا نہ دیا جائے، اس کی پیروی مذموم شمار ہوتی ہے۔ پس قرآن قابل عمل اور پیروی کے لائق نہ رہے گا۔ کیونکہ فواتح سور کی مدد سے کسی آیت کے مفہوم کی وضاحت معلوم کرنا ایک عام قاری کیلئے ناممکن ہے بلکہ فواتح سور تو بذات خود مجمل ہیں۔

۳۔ تیسرا قول، یہ ہے کہ متشابہ وہ آیات ہیں جن میں اجمال پایا جاتا ہو اور محکم وہ آیات ہیں جن میں تفصیل پائی جاتی ہو۔ لیکن علامہ طباطبائیؒ کے نزدیک یہ قول بھی درست نہیں ہے؛ کیونکہ مجمل و مفصّل میں اہل لسان کا طریقہ یہ ہے کہ وہ مجمل کا ایسا بیان تلاش کرتے ہیں کہ جس کی روشنی میں وہ اجمال سے نکل آتا ہے اور تب وہ اس کی پیروی کرتے ہیں۔ لیکن پھر بھی پیروی تو مجمل ہی کی ہو جاتی ہے۔ اب اگر متشابہ اور محکم کا معاملہ بھی بعینہٖ مجمل و مفصل والا ہو تو اس سے لازم آتا ہے کہ متشابہ کی پیروی مذموم نہ ہو۔ جبکہ متشابہات کی پیروی، دلوں کی کجی کا سبب اور مذموم قرار دی گئی ہے۔

۴۔ چوتھا قول، یہ ہے کہ متشابہات وہ آیات ہیں جو منسوخ ہو چکی ہیں اور محکمات ناسخ آیات ہیں۔ یہ قول ابن عباس، ابن مسعود اور چند دیگر صحابہ کی طرف منسوب ہے۔ اس قول کے بارے میں علامہؒ فرماتے ہیں کہ اگر اسے مان بھی لیا جائے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پس متشابہ آیات، منسوخ آیات میں منحصر ہوں۔ کیونکہ متشابہ آیات کی صفت یہ ہے کہ کج دل افراد فتنہ بپا کرنے کی غرض سے اُن کی پیروی کرتے ہیں۔ اور بہت سی غیر منسوخ آیات میں بھی یہ ممکن ہے کہ لوگ فتنہ پھیلانے کی غرض سے ان کی پیروی کریں۔ جیسا کہ بعض آیات صفات وافعال باری تعالی کا سہارا لے کر فتنہ گر، فتنہ پھیلانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ نیز، یہ کہ اس قول کی بنیاد پر بھی لازم آتا ہے کہ قرآن کریم کی آیات تین قسموں میں تقسیم ہوں: یعنی متشابہ (منسوخ)، محکم (ناسخ) اور نہ متشابہ، نہ محکم (وہ آیات جو نہ منسوخ ہوئی ہیں، نہ ناسخ ہیں) جبکہ یہ امر بھی سورۂ آل عمران کی آیت ۷ کے ساتھ منافات رکھتا ہے جو قرآنی آیات کو فقط دو قسموں میں تقسیم کرتی ہے۔

۵۔ پانچواں قول، یہ ہے کہ محکمات، وہ آیات ہیں جن کی دلیل واضح ہے جبکہ متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن کا فہم فکر و تأمل کا محتاج ہے۔ علامہ طباطبائیؒ کی نظر میں یہ قول بھی باطل ہے۔ کیونکہ اگر دلیل کے واضح ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان آیات کے مضامین بدیہی ہوں تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ وہ تمام آیات جن میں احکام و فرائض الٰہی کی بات ہوئی ہے متشابہ شمار ہوں؛ کیونکہ احکام و فرائض کے دلائل عقل پر واضح نہیں ہیں۔ اور اگر ان آیات کے دلائل کے واضح ہونے سے مراد یہ ہے کہ خود قرآن کریم سے ان کے مضامین کی تائید میں واضح دلائل موجود ہوں تو پھر قرآن کریم کی سب آیات محکم قرار پائیں گی۔ کیونکہ قرآن کریم کی کوئی آیت بھی ایسی نہیں کہ جس کے مضمون کی تصدیق، دیگر آیات سے نہ

ہوتی ہو۔ اسی لیے تو قرآن کریم کو "کتاب متشابہ مثانی" کا عنوان دیا گیا ہے۔ بنابراین، لازم آتا ہے کہ قرآن کریم کی سب آیات محکم ہوں اور یہ خلاف فرض ہے۔

٦۔ چھٹا قول، یہ ہے کہ محکم آیات وہ ہیں جن کے مضامین کا علم حاصل کیا جا سکتا ہے اور متشابہ آیات وہ ہیں جن کے مضامین کا علم حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر وہ آیات جن میں قیامت کے وقت کی بات ہوئی ہے، متشابہ ہیں کیونکہ انسان قیامت کے قیام کے وقت کی اطلاع حاصل نہیں کر سکتا۔ علامہ طباطبائیؒ کی نظر میں یہ قول بھی باطل ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قرآن کریم کی سب آیات خواہ محکم ہوں، خواہ متشابہ، کسی نہ کسی معنی پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ہر وہ مطلب جس پر قرآن کریم کی آیات دلالت کرتی ہوں، اس کے علم کا حصول ممکن ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کتاب جو نور ہے، ہدایت ہے اور حق و باطل کو صاف صاف بیان کرنے والی ہے، اس کی آیات ایسے معانی پر دلالت کرتی ہوں جن تک فہم کی رسائی ممکن نہ ہو۔ اور جہاں تک اُن مطالب کا تعلق ہے کہ جن تک فہم بشر کی رسائی ممکن نہیں تو علامہؒ کی نظر میں ایسے مطالب کسی آیت کے الفاظ میں بیان ہی نہیں ہوئے۔

٧۔ ساتواں قول، یہ ہے کہ محکم آیات وہ آیات ہیں جن میں شریعت کے احکام بیان ہوئے ہیں جبکہ متشابہ آیات وہ ہیں جن میں سے بعض، بعض دیگر کی تصریف کرتی ہیں۔ یہ قول مجاہد کی طرف منسوب ہے۔ اس قول پر علامہؒ کے نقد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں تصریف سے مراد یہ ہے کہ بعض آیات، بعض دیگر آیات کے معانی اور مدلولات کو معین کرتی ہیں۔ بہر حال، علامہ طباطبائیؒ کی نظر میں یہ قول بھی باطل ہے؛ کیونکہ اگر یہاں "صرف" یا دوسرے الفاظ میں "معانی کی تعیین" سے مراد، ہر وہ قرینہ ہے کہ جس کے ذریعے کسی لفظ کا معنی معین ہوتا ہے (جیسا کہ عام کا معنی، خاص کے قرینے سے اور مطلق کا معنی، مقیّد کے قرینے سے معین ہوتا ہے۔ یا اسی طرح سے دیگر قرائن کہ جن کی مدد سے بعض الفاظ کے معانی معین ہوتے ہیں) تو پھر وہ آیات بھی محکم نہیں رہتیں جنہیں اس قول میں محکم قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ جن آیات میں احکام الٰہی بیان ہوئے ہیں اُن کے معانی کی تعیین بھی بہت سے قرائن کے ذریعے ممکن ہوتی ہے۔ پس یہ آیات محکم نہیں ہیں، حالانکہ یہ قول انہیں محکم قرار دیتا ہے۔

اور اگر "صرف" یا معانی کی تعیین سے مراد یہ ہے کہ بعض آیات کا اپنا معنی خود بخود معین ہے اور یہ آیات بعض دیگر آیات کے معنی کی تعیین میں معاون واقع ہوتی ہیں، تو پھر آیات الاحکام کے علاوہ دیگر سب آیات کو متشابہ قرار دینا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں آیات الاحکام کے علاوہ کسی آیت کا معنی بھی نہ معین ہو گا اور نہ ہی قابل فہم۔ کیونکہ جب فرض یہ ہو کہ وہ آیات جو معارف بیان کرتی ہیں، سب کی سب متشابہ ہیں تو ان کا معنی تب تک معین نہیں ہو سکتا جب تک کوئی قرینہ نہ آ جائے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ قرینہ کہاں سے آئے؟ آیات الاحکام تو آیاتِ معارف پر قرینہ بن نہیں سکتیں اور خود آیات المعارف میں سے بھی کوئی آیت کسی دوسری آیت پر قرینہ نہیں بن سکتی کیونکہ فرض یہ ہے کہ یہ سب متشابہ ہیں۔

٨۔ آٹھواں قول، یہ ہے کہ محکم آیات وہ ہیں جن کی فقط ایک ہی تأویل ہو سکتی ہے لیکن متشابہ آیات وہ ہیں جن کی کئی تأویلات ہو سکتی ہیں۔ یہ قول امام شافعی کی طرف منسوب ہے۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ گویا اس قول کی بازگشت یہ ہے کہ محکم آیات وہ ہیں جن کے الفاظ فقط ایک معنی میں ظہور رکھتے ہیں اور وہ اس معنی میں نص ہیں جبکہ متشابہ اس کے برعکس ہیں۔

علامہ طباطبائیؒ اس قول کو بھی ردّ فرماتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک، محکم و متشابہ کی یہ تعریف لفظی اور "تبدیل اللفظ باللفظ" کے حکم میں ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ محکم وہ ہے جس کا فقط ایک معنی ہو۔ علاوہ بر ایں، اس تعریف میں تأویل کو تفسیر اور لفظ کے معنی کے مترادف لیا گیا ہے جو کہ غلط ہے۔

٩۔ نواں قول، یہ ہے کہ محکم آیات وہ آیات ہیں کہ جن میں بعض انبیاؑ علیہم السلام اور ان کی امتوں کے قصے استحکام اور تفصیل کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ جبکہ متشابہ آیات وہ ہیں کہ جن میں یہ قصے، الگ الگ ٹکڑوں میں اور تکرار و تقطیع کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ علامہ طباطبائیؒ اس

قول کو بھی ردّ فرماتے ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے تو اس قول کا لازمہ یہ ہے کہ محکم و متشابہ آیات فقط وہی ہوں جن میں سابقہ انبیاؑ اور ان کی امتوں کے قصے بیان ہوئے ہیں؛ حالانکہ یہ امر سورۂ مبارکہ آل عمران کی آیت ۷ کے ساتھ واضح منافات رکھتا ہے۔ نیز یہ کہ متشابہ آیات کے خواص [یعنی کج دلوں کا ان آیات کو بہانہ بنا کر فتنہ گری کرنا] فقط ان آیات پر نہیں بلکہ بہت سی ایسی آیات پر بھی قابل تطبیق ہیں کہ جو آیات القصص میں سے شمار نہیں ہوتیں۔

۱۰۔ دسواں قول، یہ ہے کہ متشابہ آیات وہ ہیں جو بیان کی محتاج ہیں اور محکم آیات وہ ہیں جو کسی مزید بیان کی محتاج نہیں۔ یہ قول امام احمد کی طرف منسوب ہے۔ علامہ طباطبائیؒ کی نظر میں یہ قول بھی باطل ہے کیونکہ آیات الاحکام یقینا محکم آیات شمار ہوتی ہیں، حالانکہ یہ آیات بھی نبی اکرم ﷺ کے بیان کی محتاج ہیں۔ اسی طرح منسوخ آیات یقینا متشابہ شمار ہوتی ہیں، حالانکہ وہ کسی بیان کی محتاج نہیں ہیں۔

۱۱۔ گیارہواں قول، یہ ہے کہ محکم آیات وہ ہیں جن پر ایمان رکھنا بھی ضروری ہے اور عمل کرنا بھی؛ جبکہ متشابہ آیات وہ ہیں جن پر ایمان رکھنا ضروری ہے، لیکن عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ یہ قول ابن تیمیہ کی طرف منسوب ہے۔ علامہ طباطبائیؒ اس قول کے نقد میں فرماتے ہیں کہ شاید اس قول سے مراد یہ ہے کہ وہ آیات جو اخبار پر مشتمل ہیں متشابہ ہیں اور وہ آیات جو انشائات پر مشتمل ہیں، محکم ہیں۔ کیونکہ اگر اس قول کی یہ تأویل نہ کی جائے تو یہ ایک الگ قول نہیں بنتا بلکہ بہت سے سابقہ اقوال پر منطبق ہوتا نظر آتا ہے۔

بہر حال، علامہ طباطبائیؒ اس قول کو بھی ردّ کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کی نظر میں اس قول کا لازمہ یہ ہے کہ آیات الاحکام کے علاوہ سب آیات متشابہ ہوں اور اس کا لازمہ یہ ہے کہ معارف قرآن کا حصول ممکن نہ رہے۔ نیز لازم آتا ہے کہ منسوخ آیات بھی محکم شمار ہوں؛ حالانکہ یہ آیات مسلمہ طور پر متشابہ ہیں۔

۱۲۔ بارہواں قول، یہ ہے کہ متشابہ آیات وہ ہیں جن میں خداوند تعالی یا انبیائے الٰہی کی صفات بیان ہوئی ہیں۔ یہ قول بھی ابن تیمیہ کی طرف منسوب ہے۔ لیکن علامہ طباطبائیؒ اس قول کو بھی ردّ کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ مذکورہ قسم کی آیات متشابہ ہیں، تو متشابہ آیات کو فقط انہی آیات میں منحصر کرنے پر کوئی دلیل موجود نہیں ہے۔

۱۳۔ تیرہویں قول کے مطابق محکم آیات وہ ہیں جن کے مطالب کو انسانی عقل سمجھ سکتی ہے لیکن متشابہ آیات وہ ہیں جنہیں انسانی عقل سمجھنے سے قاصر ہو۔ علامہؒ کے نزدیک اس قول پر بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔ نیز یہ کہ بعض آیات کو انسانی عقل سمجھ سکتی ہے جبکہ ان میں محکم کی بعض خصوصیات نہیں پائی جاتیں اور اسی طرح برعکس، بعض آیات کو انسانی عقل نہیں سمجھ سکتی جبکہ ان میں متشابہ کی بعض خصوصیات مفقود ہیں۔ علاوہ برایں، آیات الاحکام متفقہ طور پر محکمات میں سے شمار ہوتی ہیں حالانکہ احکام کے فلسفہ کو سمجھنے سے بھی انسانی عقلیں قاصر ہیں۔ پس یہ قول بھی یوں ردّ ہو جاتا ہے۔

۱۴۔ چودہویں قول کے مطابق محکم آیات وہ ہیں جن سے ان کا ظاہری معنی مراد ہو اور متشابہ آیات وہ ہیں جن سے اُن کے ظاہری معنی کی بجائے خلاف ظاہر معنی مراد ہو۔ علامہؒ فرماتے ہیں کہ یہ قول متأخرین کے ہاں رائج ہے اور متأخرین اسی قول کو اساس بنا کر "تأویل" کے باب میں بھی یہ نظریہ قائم کرتے ہیں کہ: "تأویل سے مراد کسی آیت کا وہ معنی ہوتا ہے جو اس کے ظاہری معنی کے برخلاف ہو۔"

علامہ طباطبائیؒ اس قول کو بھی ناپسند فرماتے ہیں۔ ان کے مطابق محکم و متشابہ کا جو معیار یہاں بیان کیا گیا ہے، وہ اُس معیار سے مطابقت نہیں رکھتا جو سورہ آل عمران کی آیت ۷ میں قائم کیا گیا ہے۔ علاوہ برایں، قرآن کریم میں کوئی آیت ایسی نہیں ہے کہ جس سے اس کا ظاہری معنی مراد نہ ہو۔ اور اگر محکم کا معیار یہی ہے تو پھر قرآن کریم کی سب آیات کو محکم ہونا چاہیے۔

یہاں علامہؒ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ آپ خود ہی تو اس امر کے قائل ہیں کہ: " الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى " جیسی آیات میں اِن آیات کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے؛ تو پھر یہاں کیسے یہ دعوی کر رہے ہیں کہ قرآن کریم کی سب آیات سے اُن کا ظاہری معنی یقینا مراد لیا گیا ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں علامہؒ کا موقف یہ ہے کہ کسی بھی کلام کا اپنے معنی میں ظہور، متصل یا منفصل قرائن کے بعد منعقد ہوتا ہے۔ لہٰذا ہم یہ

نہیں کہتے کہ : ''الرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى'' جیسی آیات سے اُن کا ظاہری معنی مراد نہیں ہے؛ بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ایسی آیات کا معنی : ''لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ'' جیسی آیات کے قرینہ کے بعد ہی منعقد ہوتا ہے۔ لیکن انعقاد کے بعد یقینا یہ ظاہری معنی مراد ہے اور ہم اس کے منکر نہیں ہیں۔
خلاصہ یہ کہ مذکورہ قول کی بنیاد پر قرآن کریم کی کوئی آیت بھی متشابہ باقی نہیں رہتی اور یہ امر قابل قبول نہیں ہے۔
۱۵۔ پندرہواں قول، یہ ہے کہ محکم آیات وہ ہیں جن کی تأویل پر مکمل اتفاق ہو اور متشابہ آیات وہ ہیں جن کی تأویل میں اختلاف ہو۔ یہ قول اصم سے نقل کیا گیا ہے۔ علامہ طباطبائیؒ اس قول کو بھی ردّ کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک اس قول کا لازمہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی سب آیات متشابہ ہوں۔ کیونکہ قرآن کریم کی کوئی آیت ایسی نہیں ہے جس کے الفاظ، معانی یا ظہور میں کچھ نہ کچھ اختلاف نہ پایا جاتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ بعض نے یہاں تک بھی دعویٰ کیا ہے کہ سارا قرآن متشابہ ہے۔ اور بعض نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ قرآن کا ظاہر حجت نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک قرآن کی کوئی آیت بھی کسی معنی میں ظہور نہیں رکھتی۔
۱۶۔ سولہواں قول، یہ ہے کہ محکم آیات وہ ہیں جن کی تفسیر مشکل نہ ہو، جبکہ متشابہ آیات وہ ہیں جن کی تفسیر کرنا اس لیے مشکل ہو کہ وہ دیگر آیات سے لفظی یا معنوی مشابہت رکھتی ہوں۔ یہ قول راغب نے بیان کیا ہے۔ اُس نے اسی قول کو بنیاد بنا کر متشابہ آیات کی تین قسمیں کی ہیں: (۱) وہ آیات جو فقط لفظ میں متشابہ ہیں۔ (۲) وہ آیات جو فقط معنی میں متشابہ ہیں۔ (۳) وہ آیات جو لفظ و معنی دونوں میں متشابہ ہیں۔ آگے چل کر راغب نے پہلی قسم کو مزید دو اقسام میں، اور تیسری قسم کو مزید پانچ اقسام میں تقسیم کیا ہے۔ یوں مجموعی طور پر متشابہ کی آٹھ قسمیں بن جاتی ہیں۔ مزید بر ایں، اس نے متشابہ کو انسانی عقل کیلئے قابل فہم ہونے یا نہ ہونے کے لحاظ سے بھی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ یوں راغب نے محکم و متشابہ میں تقریباً سب اقوال کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔
لیکن علامہ طباطبائیؒ نے اس قول کو بھی ردّ فرمایا ہے۔ ان کے مطابق راغب کے قول کی بنیاد پر وہ آیات بھی متشابہ ہیں کہ جن میں بعض ایسے اجنبی الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عام عربی زبان میں استعمال نہیں ہوتے تھے یا ایسی مغلق تراکیب استعمال ہوئی ہیں جو عام طور پر استعمال نہیں ہوتی تھیں۔ مثال کے طور پر وہ آیات جن میں ''اَبًّا'' یا ''يَزِفُّونَ'' کے کلمات استعمال ہوئے ہیں، راغب کے پیش کردہ معیار کے مطابق متشابہ آیات ہیں۔ لیکن یہ معیار درست نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ہم متشابہ کے اس معیار کو مان لیں تو پھر اس کا لازمہ یہ ہے کہ ان آیات کا تشابہ بھی محکم آیات کی طرف رجوع کے بعد اٹھ جانا چاہیے۔ کیونکہ سورہ آل عمران کی آیت ۷ نے متشابہ کے تشابہ کے اٹھ جانے کا یہی علاج تجویز کیا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے؛ کیونکہ جن آیات کے الفاظ میں لفظی غرابت یا ترکیبی اغلاق پایا جاتا ہے، ان کا فہم، لغت کی کتابوں اور فصاحت و بلاغت کے قواعد کی طرف رجوع کے ذریعے ممکن ہے، نہ کہ محکمات کی طرف رجوع کے ذریعے۔
اس قول کی دوسری مشکل یہ ہے کہ یہ قول، سورہ آل عمران کی آیت ۷ میں متشابہ آیات کی اِس خصوصیت کے ساتھ مطابقت نہیں رکھتا کہ فتنہ گر ان آیات کی پیروی کرکے فتنہ پھیلاتے ہیں۔ اس آیت کے مطابق جن آیات سے فتنہ گر فتنہ نہ پھیلا سکیں، انہیں متشابہ نہیں ہونا چاہیے۔ جبکہ راغب کے پیش کردہ معیار کے مطابق ایسی آیات بھی متشابہ ہیں۔ کیونکہ وہ اُن آیات کو بھی متشابہ قرار دیتا ہے جن میں عمومات، اطلاقات یا اجنبی (غریب) الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔
رہا یہ دعویٰ کہ فتنہ گر اُن آیات کو دستاویز بنا کر فتنہ نہیں پھیلا سکتے جن میں عمومات، اطلاقات یا اجنبی الفاظ آئے ہیں تو اس پر علامہؒ کی دلیل یہ ہے کہ اگر فتنہ گر ان آیات کے مخصصات، مقیدات اور لغت کی کتابوں کو نظر انداز کرتے ہوئے فقط عمومات، اطلاقات یا اجنبی الفاظ کی پیروی کرتے ہوئے کوئی فتنہ بپا کرنا بھی چاہیں تو اہل زبان انہیں ایسا کرنے کی اجازت نہیں دیتے۔
کیونکہ دیگر زبانوں کی مانند، عربی زبان کی طبیعت بھی اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ عام کو خاص کے تناظر میں دیکھا جائے، مطلق کو مقید کے تناظر میں دیکھا جائے اور اگر کہیں کوئی اجنبی لفظ آجائے تو اس لفظ کے معنی کی تعیین میں لغت کی کتب کنگھالی جائیں اور بعد میں کوئی نظریہ قائم کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ راغب کے پیش کردہ معیار کے مطابق، وہ آیات جن میں عمومات اور اطلاقات آئے ہیں، متشابہ ہیں۔ لیکن علامہؒ

اس دعوی کو قبول نہیں کرتے کیونکہ ان کے نزدیک ایسی آیات سے فتنہ گر فتنہ نہیں پھیلا سکتے؛ حالانکہ قرآن کریم کے پیش کردہ معیار کے مطابق متشابہ آیات وہ ہیں جن سے فتنہ گر فتنہ پھیلا سکتے۔

علاوہ بر ایں، راغب نے متشابہ آیات کی ایک لحاظ سے تین قسمیں کی ہیں:

(1) وہ متشابہات جن کا فہم عام لوگوں کیلئے ممکن ہے۔

(2) وہ متشابہات جن کا فہم کسی کیلئے بھی ممکن نہیں ہے۔

(3) وہ متشابہات جن کا فہم بعض لوگوں کیلئے ممکن اور بعض کیلئے ناممکن ہے۔ لیکن علامہؒ کے نزدیک اس تقسیم سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ راغب کی نظر میں تأویل، فقط متشابہ آیات میں پائی جاتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس نے تأویل کے لحاظ سے متشابہات کو مذکورہ بالا تین اقسام میں تقسیم کیا ہے لیکن محکمات میں کسی ایسی تقسیم کا قائل نہیں ہوا۔ حالانکہ علامہؒ نے یہ ثابت کیا ہے کہ تأویل، فقط متشابہ آیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ پورا قرآن تأویل رکھتا ہے۔پس اس لحاظ سے بھی راغب کا قول قابل نقد ہے۔

خلاصہ

محکم و متشابہ کے باب میں مذکورہ سب اقوال کو ردّ کرنے کے بعد علامہؒ ایک بار پھر جس امر پر تاکید فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ سورہ مبارکہ آل عمران، آیت ۷ میں متشابہ آیات کی جو خصوصیات بیان ہوئی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ:

(۱) متشابہ آیات، مردّد معنی پر دلالت کرتی ہیں؛ لیکن یہ تردّد لفظی دلالت کے مبہم ہونے کی وجہ سے نہیں ہوتا کہ آپ اہل لسان کے ہاں رائج اسلوب کے ذریعے (مثال کے طور پر کوئی قرینہ ڈھونڈ کر) اس تردّد کا علاج کر سکیں؛ بلکہ یہ تردّد اس لیے پایا جاتا ہے کہ متشابہ آیت کا معنی، بعض محکم آیات کے معنی کے ساتھ ہماہنگ نہیں ہوتا۔

(۲) کسی بھی آیت کے معنی میں اگر مذکورہ بالا قسم کا تردّد پایا جاتا ہو تو اس کا لازمہ یہ ہے کہ اس آیت کے الفاظ سے جو معنی فوری طور پر عام لوگوں کے ذہن میں آتا ہے وہ معنی اپنی ذات میں کوئی نیا، عجیب اور اجنبی نہ ہو، بلکہ عام فہم اذہان کیلئے آیت کے الفاظ سے ایسا معنی اخذ کرنا معمول کا کام ہو۔ اس امر پر شاہد یہ ہے کہ عالم اسلام میں جو فرقے کجرویوں اور بدعتوں کا شکار ہوئے، وہ دراصل متشابہ آیات سے اُن کے یہی عام فہم معانی اخذ کرنے کی وجہ ہی سے گمراہ ہوئے۔ کسی نے متشابہ آیات سے خدا کیلئے جسم و جسمانیت ثابت کی، تو کسی نے جبر کا نظریہ اخذ کیا، کوئی تفویض کا قائل ہوا تو کوئی انبیاؑ کو جائز الخطا قرار دے بیٹھا۔

خلاصہ یہ کہ عالم اسلام میں جس قدر منحرف فرقے اور باطل مذاہب ظہور پذیر ہوئے، یہ سب کج دل، فتنہ گروں کی متشابہ آیات کی پیروی کے سبب ظہور پذیر ہوئے۔ نیز یہ سب کچھ اس امر کی محکم دلیل ہے کہ متشابہ آیات، ایسے معانی پر دلالت کرتی ہیں جو ان کے الفاظ سے اجنبی نہیں، بلکہ مأنوس ہوتے ہیں؛ مگر یہ کہ یہ معانی، محکم آیات کے معانی سے ہماہنگ نہیں ہوتے۔ بنا بر ایں، یہ کہنا کہ متشابہ آیات غیر مأنوس معانی پر دلالت کرتی ہیں اور یہی غیر مانوس معانی ''تأویل'' کہلاتے ہیں، ایک نادرست دعوی ہے۔

پس متشابہ آیات کے الفاظ بھی مانوس معانی پر دلالت کرتے ہیں اور محکم آیات کے الفاظ بھی مانوس و متداول معانی پر دلالت کرتے ہیں؛ اس فرق کے ساتھ کہ متشابہ آیات کے الفاظ کا کسی معنی میں ظہور، تب تک منعقد نہیں ہوتا جب تک محکمات میں موجود قرائن کو نہ دیکھ لیا جائے؛ جبکہ محکمات اپنے ظہور کے انعقاد میں ایسے قرائن کے محتاج نہیں ہوتے۔ یہاں سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ''تأویل'' فقط متشابہ آیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ پورا قرآن (خواہ متشابہ، خواہ محکم) تأویل رکھتا ہے۔اور جب ایسا ہے تو تأویل کی تعریف یہ نہیں ہے کہ: ''تأویل، عبارت ہے کسی آیت کے اجنبی اور غیر متداول معانی سے''۔ بلکہ تأویل سے مراد وہی ہے جو علامہؒ کے بیان میں اجمالی طور پر گذر چکی ہے اور ایک بار پھر علامہؒ اپنی تفسیر میں اس کی تفصیل بیان کرتے ہیں۔اِس تفصیل کا خلاصہ درج ذیل ہے:

نتیجہ گیری

سابقہ بحث میں ہم نے یہ کہا کہ علامہ طباطبائیؒ کے نظریہ کے مطابق : " تأویل، اُس سرچشمے کا نام ہے جس سے احکام و معارف الٰہی لیے جاتے ہیں اور تأویل اُس مأخذ کا نام ہے جس سے حلال و حرام کے احکام اخذ کیے جاتے ہیں۔" علامہؒ، ایک طولانی بحث کے ضمن میں محکم و متشابہ کے باب میں مذکورہ بالا ۱۶ اقوال کو ردّ کرنے کے بعد ایک بار پھر ہمیں اسی نتیجہ پر لا کھڑا کرتے ہیں کہ تأویل فقط متشابہ آیات میں نہیں بلکہ ہر آیت میں پائی جاتی ہے۔ علامہ طباطبائیؒ نے اس دعویٰ پر ایک دلیل یہ قائم کی ہے کہ سورہ مبارکہ آل عمران کی آیت ۷: - " وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ" میں "تَأْوِيلَهُ" کی ضمیر کا مرجع، متشابہ نہیں بلکہ "الکتاب" ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے: "۔۔۔ أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ ۔۔۔ وَ مَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ ۔۔۔"

پس تأویل فقط متشابہ آیات میں نہیں بلکہ پورے قرآن کریم میں پائی جاتی ہے۔ نیز یہ کہ تأویل سے مراد، کسی آیت کے ظاہری الفاظ کے ساتھ میل نہ کھاتے، اجنبی معانی نہیں، بلکہ ہر آیت میں بیان شدہ احکام و معارف اور حلال و حرام کے احکام کا مأخذ اور منبع ہے۔ لہٰذا تأویل وہ خزانہ ہے جس کا علم فقط خدا کے پاس ہے یا خدا کے اذن سے اس علم میں فقط "راسخون فی العلم" ہی خدا کے ساتھ شریک ہیں۔ پس علامہ طباطبائیؒ کی عبارت میں :

"انّ الحق فی تفسیر التأویل أنّه الحقیقة الواقعیة التی تستند الیها البیانات القرآنیة من حکم أو موعظة أو حکمة و أنّه موجود لجمیع الآیات القرآنیة: محکمها و متشابهها و أنّه لیس من قبیل المفاهیم المدلول علیها بالالفاظ بل هی من الامور العینیة المتعالیة من أن یحیط بها شبکات الالفاظ، انّما قیّدها الله سبحانه بقید الالفاظ لتقریبها من أذهاننا بعض التقریب؛ فهی کالامثال نضرب لیقرب بها المقاصد و توضح بحسب ما یناسب فهم السامع کما قال تعالی: " وَالْكِتَابِ الْمُبِينِ o إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ o وَإِنَّهُ فِي أُمِّ الْكِتَابِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيمٌ" (الزخرف ا تا ۴)

یعنی: " تأویل کی تفسیر میں حرفِ حق یہ ہے کہ تأویل، وہ واقعی حقیقت ہے کہ جس کی طرف قرآنی بیانات، خواہ حکم ہوں، موعظ ہوں یا حکمت، مستند ہوتے ہیں؛ نیز یہ کہ تأویل، قرآن کی سب آیات، خواہ محکم، خواہ متشابہ، میں پائی جاتی ہے۔ اور تأویل، اُن مفاہیم کی سنخ سے نہیں ہے کہ جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ یہ تو اُن عینی اور اعلیٰ و ارفع امور میں سے ہے کہ جنہیں الفاظ کے جال میں نہیں پھنسایا جا سکتا۔ اب اگر اللہ تعالی نے ان امور کو الفاظ کے قالب میں بند کیا بھی ہے تو یہ محض اس لیے کہ یہ امور ہمارے ذہنوں کے کچھ قریب آسکیں؛ پس ان کی مثال، اُن ضرب المثل جیسی ہے کہ جنہیں بیان کریں کے ہم مطالب کو اذہان کے قریب لاتے اور سامع کے فہم کے مطابق انہیں قابل فہم بناتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: اور روشن کتاب کی قسم! ہم نے اس قرآن کو عربی بنایا ہے تا کہ تم سمجھ سکو اور بے شک یہ کتاب (لوح محفوظ) میں ہمارے پاس برتر، پر حکمت ہے۔"

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ یاد رہے آیۂ شریفہ کا مذکورہ ترجمہ علامہ طباطبائیؒ کے نکتۂ نظر سے پیش کیا گیا ہے۔ تفصیلات جاننے کیلئے تفسیر المیزان میں مربوطہ بحث ملاحظہ فرمایئے !

2۔ یعنی: " وہ رحمٰن جس نے عرش پر اقتدار قائم کیا۔"

3۔ یعنی: " کوئی چیز اس کی مثل کی مانند نہیں ہے۔"

4۔ یعنی: "وہ اپنے ربّ کی (رحمت کی) طرف دیکھ رہے ہوں گے۔"

5۔ یعنی: " نگاہیں اسے نہیں پا سکتیں جب کہ وہ نگاہوں کا پالیتا ہے۔"

6۔ یعنی: "بے شک تیرا پروردگار کمین میں ہے" (فجر، ۱۴)

7۔ یعنی: " اور تیرے پروردگار [کا امر] آیا اور ملائکہ صفیں باندھے کھڑے ہوگئے" (فجر، ۲۲)

8۔ یعنی: " [خدا نے] آسمان سے پانی نازل فرمایا؛ پس اس سے ندیاں اپنی ظرفیت کے مطابق بہہ نکلیں۔۔۔" (الرعد، ۱۷)

9۔ یاد رہے کہ یہ عینی حقائق، ضروری نہیں کہ مادی ہوں بلکہ مادی و غیر مادی اور واقعی و نفس الامری ہو سکتے ہیں۔ (مؤلف)